جناب بشیر احمد ڈار

قائدِ اعظم۔ تاریخ کے پس منظر میں

برصغیر کی تاریخ کا ایک نمایاں موڑ ۱۸۵۷ کا وہ سال ہے، جب اس ملک کے باسیوں نے ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف غیر منظم اور بے منصوبہ جنگ لڑی اور ناکامی سے دوچار ہوئے۔ مسلمانوں کو پہلی دفعہ شاید محرومیت کا احساس ہوا۔ ایسا احساس جس سے تنقیل کے متعلق مایوسی کی تاریکی پھیل گئی۔

مسلمانوں نے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش میں ہر چیز کو داؤں پر لگا دیا تھا اور جب ان کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو وہ زوال کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوب چکے تھے۔ حالات ایسے تھے کہ جنگ کا امکان بالکل ختم ہو چکا تھا اور اب اس ملک میں عزت کی زندگی بسر کرنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

انگریز نے بغاوت کا تمام تر الزام مسلمانوں کے سر لگا دیا اور اس طرح انگریزوں، گورکھوں اور سکھوں نے مل کر مسلمانوں پر ہر قسم کے مظالم توڑے۔ دوسری طرف ہندو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی کاروبار میں مددگار تھے، دولت کی ریل پیل کے باعث ملکی سیاست میں خاص وزن رکھتے تھے جس کو انھوں نے واضح طور پر مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ پلاسی کی جنگ جس نے اس برصغیر کی سیاست کا رُخ تبدیل کیا، درحقیقت انہی ہندو ساہوکاروں کی سازش کا نتیجہ تھی، جس کے باعث انگریزوں کا قبضہ قطعی اور مستحکم ہوا۔

ایسے حالات میں جب مسلمانوں کا مستقبل بالکل مخدوش تھا، سرسید نے ان کی رہنمائی کی ذمہ داری قبول کی۔ سرسید نے اپنی زندگی میں جو کام انجام دیئے ان کا ذکر تو بہت تفصیل چاہتا ہے لیکن یہاں صرف چند باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

پہلا کام جو سرسید نے انجام دیا وہ یہ تھا کہ باوجودیکہ انگریز اور ہندو دونوں نے مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی کا اظہار کیا تھا، سرسید نے پوری کوشش کی کہ ان کی کسی تحریر یا تقریر میں کسی کے خلاف بیزاری یا نفرت کا اظہار نہ ہو، بلکہ انھوں نے دونوں کے ساتھ محبت اور دوستی قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ غیر مسلموں کے ساتھ ان کے ذاتی مراسم تو تھے ہی، ان کی پرخلوص خواہش تھی کہ مسلمان اپنی ہمسایہ قوموں

سے محبت ویگانگت کا تعلق قائم کریں تاکہ ان کی توجہ تخریبی اور منفی مقاصد سے ہٹا کر خالص تعمیری اور مثبت مقاصد کی طرف منعطف کرائی جا سکے۔ مسلمان کچھ فطری طور پر تشدد اور جنگ کی طرف بہت جلد مائل ہو جانے والے تھے اور سر سید اپنے سامنے اس کے مظاہرے دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے انتہائی کوشش کی کہ مسلمان تشدد کا راستہ چھوڑ کر صلح جوئی، امن پسندی اور آشتی کا راستہ اختیار کریں۔

دوسرا عظیم کارنامہ جو سر سید نے انجام دیا وہ مسلمانوں کو اپنے منفرد وجود کا احساس دلانا تھا۔ برصغیر میں بے شمار قومیں باہر سے آ کر آباد ہوئیں۔ لیکن آہستہ آہستہ سب کا انفرادی وجود ختم ہو گیا۔ ان کے تمدّن اور طرزِ زندگی کا وجود اب محض کھنڈرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کا کوئی زندہ نمونہ موجود نہیں۔ جب سر سید نے اپنا کام شروع کیا، اس وقت مسلمان کو، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، بدنام اور رسوا کرنے کی مہم زوروں پر تھی۔

جب انگریزوں نے ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس قائم کی تو ہیوم نے پوری کوشش کی کہ مسلمان اس میں شامل ہو جائیں اور اس طرح ایک متحدہ قومیت کا تصوّر قائم کیا جا سکے۔ یقیناً ایسا تصوّر حکومت برطانیہ کے سامراجی مقاصد کی تکمیل میں مددگار تھا لیکن سر سید نے فوراً اس خطرے کو بھانپ لیا اور اس کے مضمرات کو انھوں نے اپنی مختلف تقریروں میں کھول کر بیان کیا۔ آبادی کے لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب چار اور ایک کا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر برطانیہ نے اختیارات ملک کے باشندوں کو منتقل کرنے شروع کیے تو لازماً اس ملک پر جمہوری اصولوں کے مطابق حکومت کا اختیار ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوگا۔ عملی طور پر جہاں کہیں مخلوط انتخاب رائج ہوا، (مثلاً کلکتہ میں) وہیں مسلمان اپنے حق سے محروم ہوئے۔ ملازمتوں کے سلسلے میں بھی یہی حال ہوا۔ مسلمان چونکہ تعلیم میں پیچھے تھے، اس لیے ان کے لیے یہ طریق کار نقصان دہ تھا۔ چنانچہ ان ہی وجوہ کی بنیادوں پر سر سید نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ انتخاب اور ملازمتوں میں مخصوص نشستوں کا مطالبہ کیا۔

ان کی سیاسی تحریک دو قومی نظریے کا آغاز تھی۔ سر سید ۱۸۹۸ء میں فوت ہوئے اور ان کے بعد ملک کے حالات اور زیادہ تشویش ناک ہوتے گئے۔ ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے اپنی مصلحت کی بنا پر بنگال کو تقسیم کیا جس سے مسلمانوں کو یہ فائدہ حاصل ہوا کہ اس ملک کے شمال مشرقی حصے میں ایک ایسا صوبہ عالمِ وجود میں آیا جہاں ان کی واضح اکثریت تھی۔ یہ قدم مسلمانوں کے لیے فائدہ مند تھا لیکن

ہندوؤں نے اسے اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے تشدد کی تحریک چلائی۔ اس تحریک کے زیرِ اثر انگریزی حکومت نے ملک میں نئے دستور کی رُو سے کچھ مراعات دینے کا اعلان کیا۔ ایسے حالات میں مسلمانوں نے ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی۔ جس کا بنیادی مقصد آئندہ دستور میں مسلمانوں کے لیے کچھ تحفظات حاصل کرنے کی کوشش تھا تاکہ ان کا انفرادی وجود قائم رہ سکے۔ ان مقاصد میں ایک مقصد واضح طور پر شامل تھا کہ مسلم لیگ کوشش کرے گی کہ مسلمانوں میں غیر مسلم برادرانِ وطن کے خلاف کسی قسم کا جذبہ منافرت پیدا نہ کیا جائے۔

چنانچہ اقبال کی زندگی کا ابتدائی دور انہی دو اصولوں کی پیروی کا واضح نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ ملک کی آزادی کے لیے دل سے خواہاں تھے اس لیے کہ زمانے کا رُخ بدل چکا تھا۔ جاپان نے روس کو جو شکست دی اور آئرلینڈ والوں نے اپنی آزادی کے لیے جو جدوجہد شروع کر رکھی تھی وہ ایسے عوامل تھے جن کے زیرِ اثر برصغیر کے باشندوں میں آزادی کا جذبہ بڑی شدت سے موجزن تھا۔ دوسری طرف آزادی کی اس تڑپ کے ساتھ ساتھ وہ برادرانِ وطن سے محبت و یگانگت کے جذبہ کے فروغ کے شدید متمنی تھے۔

اس دور کی نظمیں جو بانگ درا اور دیگر کتابوں میں موجود ہیں دو قسم کے خیالات سے بھری ہوئی ہیں۔ سید کی لوحِ تربت میں جو جنوری ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی ایک شعر ہے:

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

صدائے درد میں ان کو گلا ہے کہ اس سرزمین میں جو اُن کا وطن ہے ہر طرف نفاق اور نفرت کے مظاہرات نظر آتے ہیں اور ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نوعِ انسان قوم ہو میری، وطن میرا جہاں، اور اقبال ملت و آئین سے دل کلی طور پر آزاد ہو۔

۱۹۰۴ء میں انھوں نے ایک نظم "تصویرِ درد" لکھی جس میں اپنے وطن کی مایوس کن حالت غلامی کے خلاف دل کا غبار نکالا ہے:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

اجاڑا ہے تمیزِ ملّت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

نیا شوالہ جو مارچ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا، اس سلسلے میں بے مثال نظم ہے جس میں وطن اور اہلِ وطن سے محبت کا اظہار شاید پورے عروج پر نظر آتا ہے اور اس وطن کی خاطر وہ مذہب تک کو خیرباد کہنے کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔ برہمن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں

لیکن حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے چلے گئے کہ اقبال کا یہ مسلک بے مقصد ہو کر رہ گیا اور برہمن کو اس نے جو دعوتِ اتحاد و یگانگت دی تھی، اس کا تسلی بخش جواب اس کی طرف سے نہ مل سکا۔

یہاں سرسید اور اقبال کے تجربات کی یکسانیت ہمارے سامنے نمایاں ہو جاتی ہے جب ہیوم نے نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی اور اس میں مسلمانوں کو شامل کرنے کے لیے ہر جائز و ناجائز قدم اٹھائے تو سرسید کو محسوس ہوا کہ متحدہ قومیت کا یہ نعرہ برطانوی سامراج کی اسلام دشمنی کی ایک علامت ہے۔ انھوں نے اپنے پرانے تصورات و اقدامات پر نظرِ ثانی کی اور آئندہ کے لیے اپنے لیے ایک نیا راستہ تجویز کیا۔ اسی طرح اقبال نے اپنی ابتدائی زندگی کے متحدہ قومیت کے تصور کا جب یورپ کی فضا میں جا کر جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو سامراجی مفاد اور اسلام دشمنی کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہے تو فوراً اس کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا۔

چنانچہ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے ۷ ستمبر ۱۹۱۲ء کو مدیر نقیب (بدایوں) کو لکھا، اس میں فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں سب سے زیادہ بڑا دشمن اسلام، اسلامیوں کا فصلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب میں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا اس وقت میں یورپ میں تھا

اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب وہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔

اس جذبے سے سرشار ہو کر اقبال نے یہ اشعار لکھے:

اپنی ملّت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

جوں جوں مسلمانوں میں اپنے جداگانہ وجود، اپنی تمدنی خود اختیاری اور علیحدہ سیاسی حقوق کا احساس شدید ہوتا گیا، ہندوؤں کی طرف سے مخاصمت اور انتقام کا مظاہرہ تیز ہوتا گیا، وہ ہر مصالحت کے لیے تیار ہیں، لیکن ہر حالت میں اپنے جمہوری حقوق یعنی اکثریت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

جب دستوری ارتقا کے سلسلے میں سائمن کمیشن اپنے کام میں مشغول تھا اور ہندوؤں کی طرف سے نہرو رپورٹ پیش کی جا رہی تھی تو اس خطرناک مرحلے پر صرف اقبال کی بصیرت افروز قیادت تھی جس نے مسلمانوں کو اس موقع پر بچائے رکھا۔

۱۹۲۹ء کے ابتدائی دنوں میں انہی مسائل پر بحث کے لیے آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی میں قائم ہوئی۔ مسلم مطالبات کی ایک قرارداد پر بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ایک مختصر تقریر کی جو اس نکتہ نگاہ کی وضاحت کرتی ہے، جو میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔ (فرماتے ہیں):

"گزشتہ تین سال سے ہم کو جو مشاہدات و تجربات حاصل ہو رہے ہیں وہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں۔ ہم کو جو باتیں اپنے برادرانِ وطن کے متعلق قیاسی طور پر معلوم تھیں، یقینی طور پر ہمارے علم میں آگئیں۔"

"میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل قائم کی تھی۔ وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔"

"آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ

رہنا ہے، تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنایا جائے۔"

پھر جب نہرو رپورٹ تیار ہو رہی تھی تو علامہ اقبال نے مرتبین کو تجویز بھیجی کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کو جو اس وقت چار مختلف علاقوں میں منقسم ہے، ایک ہی صوبہ بنا دیا جائے لیکن ہندوؤں نے اس تجویز کو کلی طور پر رد کر دیا۔ اقبال کا یہ خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کی اکثریت ایک علاقے میں مرکوز نہیں ہو گئی۔ مسلمانوں کی ثقافتی زندگی کا ارتقا ممکن نہیں۔ چونکہ یہ تجویز منظور نہیں ہو سکی، اس لیے علامہ اقبال نے اپنے مسلم لیگ کے خطبہ ۱۹۳۰ء میں وہ مشہور تجویز پیش کی جسے صحیح طور پر پاکستان کا ابتدائی نقشہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس کے مطابق ہندوستان کے شمال مغربی حصے ملا کر ایک آزاد ریاست قائم ہونا چاہیئے اور اسی میں اس ملک کے مسلمانوں کا مستقبل وابستہ ہے۔

جب ہم قائداعظم کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو سرسید اور اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار اور تجربات کا نقشہ یہاں بھی نظر آتا ہے۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا کردار بہت نمایاں تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ہر دور میں نمایاں کام کیا۔ یہاں تک کہ خود ہندوؤں کی طرف سے انھیں ہندو مسلم مفاہمت کے سفیر کا لقب ملا۔ جب مولانا محمد علی جوہر نے ۱۹۱۳ء میں انگلستان میں قائداعظم کو مسلم لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی تو انھوں نے اس شرط سے شامل ہونا منظور کیا کہ ان کی مسلم لیگ میں شمولیت اور مسلمانوں کے مفاد کے لیے ذمہ داری کسی طرح بھی ان کی ملک کی آزادی کی ذمہ داری کے راستہ میں حائل نہ ہوگی۔ اس شرط سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ محمد علی جناح کے نزدیک ملک کی آزادی کی جنگ ایک اولین ذمہ داری ہے اور مسلمانوں کے مفاد کا مسئلہ ایک ثانوی چیز جس کو پہلے مقصد کے لیے قربان کیا جا سکتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہی موقف ہے جو کسی زمانے میں اقبال نے پیش کیا تھا، یعنی اگر مذہب و ملت کی تفریق ملک کی آزادی میں مخل ہو تو اسے رد کر دینا چاہیے۔ مثلاً "نیا شوالہ" نظم میں ایک شعر تھا:

اگنی ہے جو وہ نرگن، کہتے ہیں برہمن اس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

یعنی ملک کی آزادی کی خاطر مسلمان اور ہندو کی تمیز ایک بے کار شے ہے۔ اسی خوش گوار ماحول میں لکھنؤ پیکٹ منظور ہوا جس کی رو سے کانگرس نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب تسلیم کر لیا، ۱۹۱۶ء، اس کے بعد کئی سالوں تک مسلمانوں اور ہندوؤں میں بہتر ماحول قائم رہا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کے سیشن میں محمد علی جناح کے مندرجہ ذیل الفاظ قابل غور ہیں۔

اس ملک پر حکومت ہندوؤں کی نہیں ہوگی اور نہ مسلمانوں کی ہوگی اور انگریز تو خارج از بحث ہیں۔ یہاں حکومت اس ملک کے باشندوں کی ہوگی۔

لیکن اس قسم کی تقریر کرنے والا شخص بہت جلد حالات کے ہاتھوں مجبور ہو گیا، بالکل اسی طرح جس طرح اس سے پہلے سرسید اور اقبال ایک انقلاب سے دوچار ہوئے تھے، محمد علی جناح کو بھی ایسے ہی ذہنی انقلاب سے دوچار ہونا پڑا۔

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد حالات نے ایک بالکل نیا رُخ اختیار کیا۔ ایسا رُخ جس سے کانگریس کے ہندو لیڈروں کے باطنی عزائم کھل کر سامنے آنے لگے اور وہی حالات پیدا ہو گئے جنھوں نے سرسید کو ایک نیا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

محمد علی جناح نے آخر دم تک کانگریس کا ساتھ دیا۔ عام مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ کے خلاف انھوں نے سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا اور جداگانہ انتخاب کی جگہ بعض شرائط کے ساتھ مخلوط انتخاب بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود ہندوؤں کا رویہ غیر مصالحانہ رہا۔

نہرو رپورٹ ایک متنازعہ مسئلہ تھا اور اس میں محمد علی جناح نے چند ترمیمات پیش کیں، جن میں یہ مطالبات شامل تھے۔

۱۔ مرکز میں مسلمانوں کو تہائی نمائندگی ملنی چاہیے۔

۲۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی آبادی کے تناسب سے ہونی چاہیے۔

۳۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ صوبہ بنایا جائے اور اس طرح سرحد کو صوبائی درجہ دیا جائے۔

لیکن جب نہرو رپورٹ کے مرتبین نے ان تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو وہ انقلاب رونما ہوا جس کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی۔ جناح نے اعلان کر دیا کہ آج کے بعد ہمارے اور آپ کے راستے جدا جدا ہو گئے ہیں۔

اس مختصر سے جائزے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں، اقبال اور قائداعظم کی سیاسی زندگی کا آغاز ملک کے ساتھ وفاداری سے ہوا۔ لیکن کچھ ہندوؤں کے رویے کے باعث اور زیادہ تر مسلمانوں کے ملّی احساس کی شدت کی وجہ سے آخر کار وہ مغربی قوم پرستی کے جنگل سے آزاد ہوئے اور وحدتِ ملّی کے آفاقی تصوّر کو اختیار کیا، جس کا منطقی نتیجہ پاکستان کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔

اساسیاتِ اسلام

(مولانا محمد حنیف ندوی)

اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں اور کس حد تک ان سے فرد و معاشرہ کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ موجودہ دور کے غلط علمی رجحانات نے کن کن غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے ان کا کیا جواب ہے؟ اسلام علوم و فنون کے ارتقا کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے اور عقیدہ و عمل کے وہ کون سے خطوط ہیں جو انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہیں؟

اساسیاتِ اسلام میں ان سوالات سے متعلق بڑے یقین پرور اور پُر اثر اسلوب میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام میں ان تمام مشکلات کا تسلّی بخش حل پایا جاتا ہے جن سے کہ آج نوعِ انسانی دوچار ہے۔

صفحات: ۱۶+۲۸۴ قیمت: ۱۲/۵۰ روپے

(ملنے کا پتہ)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور